بشیر احمد ڈار

سقراط اور اس کا فلسفۂ اخلاق

مغربی فلسفے کی تاریخ میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سقراط فلسفہ و حکمت کو آسمان کی بلندیوں سے اُتار کر زمین پر لے آیا اور لوگوں کو سب سے پہلی بار دانائی کی باتوں سے آشنا کیا۔ اگر اس مقولے میں سقراط کی تعریف و عظمت پوشیدہ ہے تو شاید بہت کم لوگ اس سے انکار کرنے کی جرأت کریں۔ لیکن اس کا مقصد اگر یہ ثابت کرنا ہو کہ حکمت یا وہ فلسفیانہ مباحث جو ہمیں سقراط یا اس کے شاگرد افلاطون کے ہاں ملتے ہیں ان سے پہلے کہیں موجود نہ تھے تو یہ محض ایک تاریخی غلط بیانی ہو گی یا اسے مغربی مصنّفین کی عصبیت کا ایک بھونڈا سا اظہار سمجھ لیجئے جو کسی مغربی کیلئے کسی مشرقی کا مرہونِ منت ہونا گوارا نہیں کر سکتی۔[1]

جس زمانے میں سقراط یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہؤا (۴۶۹ قبل مسیح) اس وقت اور اس سے کافی پہلے یونان کے لوگ اپنے اردگرد کے علاقوں میں کثرت سے جا آباد ہوئے تھے اور اسی طرح دوسرے ملکوں کے لوگ بھی کثرت سے یونان میں آباد تھے۔ چنانچہ یونانیوں کے ہاں یہ قانون مدت سے رائج تھا کہ اگر کوئی یونانی کسی غیرملکی سے شادی کر لے تو وہ اپنے شہری حقوق سے محروم کیا جاتا۔ اس بنا پر پیری کلز اسپاشیا سے باقاعدہ شادی نہ کر سکا تھا، اگرچہ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اس قانون سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ یونانی ریاستوں میں کثرت سے ہمسایہ ملکوں کے لوگ آباد تھے۔ سولن جس کو یونانی اپنے سات داناترین افراد میں شمار کرتے ہیں اس نے ۵۷۲ قبل مسیح میں مصر اور مشرقی ممالک کا سفر اس لئے اختیار کیا تا کہ وہ علم و تمدن کی ترقی یافتہ شکلوں سے روشناس ہو سکے۔ اسی طرح فیثاغورث (جو ۵۸۰ قبل مسیح پیدا ہؤا) نے اسی زمانے میں عرب، شام، ہندوستان اور مصر کا سفر کیا اور واپس آ کر ایک قسم کا صوفیانہ نظام قائم کیا جس کا مرکز خانقاہ

---

[1] روسی مفکّر نکولائی ڈنیلوسکی (Danilevski) کی رائے ہے کہ یونانی تہذیب کو یورپی تہذیب کہنا ہی بالکل غلط ہے کیونکہ یونانی تہذیب کا اوّلیں مرکز مغربی ایشیا تھا، وہاں سے وہ ایتھنز منتقل ہؤا اور اس کے بعد وہ اسکندریہ میں جا پہنچا۔ گویا جس فلسفہ کو یورپ والے اپنی خاص مقامی اور جغرافیائی تہذیب کا سنگِ بنیاد تصوّر کرتے ہیں وہ درحقیقت ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں برّاعظموں کے بلند رتبہ مفکّرین کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دیکھئے سوروکن کی کتاب "ایک عبوری دور کے اجتماعی فلسفے" (لندن ۱۹۵۲) صفحہ ۵۳۔

تھی۔ فیثاغورث کے تمام پیرو آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے تھے اور ان میں ایک قسم کی اشتراکیت رائج تھی۔ گوشت، انڈے وغیرہ کا استعمال اور جانوروں کی قربانی ممنوع تھی۔ کسی بے ضرر جانور کو مارنا یا سرسبز درخت کو کاٹنا برا سمجھا جاتا تھا۔ زندگی کی خوشیوں میں اس طرح حصہ لینا کہ اس سے انسان کی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کم ہو فیثاغورث کے نزدیک ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اگرچہ اس کے ہاں کوئی غیر فطری اور ظاہری سنجیدگی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا خود اس کی زندگی بالکل سادہ تھی، اس نے کبھی شراب استعمال نہیں کی اور سوکھی روٹی اور شہد اس کی خوراک تھی۔ سفید اور بے داغ کپڑے پہنتا تھا۔

فیثاغورث کا یہ نظام محض عملی اور راہبانہ نہ تھا بلکہ اس میں زندگی کے علمی مسائل کی طرف پوری توجہ دی جاتی تھی۔ خانقاہوں میں تعلیمی نصاب میں چار مضامین شامل تھے: علم ہندسہ، حساب، علم ہیئت اور موسیقی اور ان کی مدد سے وہ اپنے پیروؤں میں ذہانت، علمی استعداد اور اخلاقی و مذہبی احساسات و جذبات میں توازن و عدل پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ طالب علموں کے دو درجے تھے، ایک ابتدائی اور دوسرا انتہائی۔ ابتدائی درجے میں ایک شخص کو پانچ سال تک ایک قسم کی جسمانی اور ذہنی تربیت دی جاتی تھی جس کے بعد انہیں آخری درجے میں علوم کا انتہائی مقصد اور مدعا اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کے اصول سمجھائے جاتے تھے۔ فلسفہ کا لفظ جو یونانی زبان سے لیا گیا ہے فیثاغورث کی طرف منسوب ہے۔ اس سے پہلے عام طور پر صوفیا (حکمت) کا لفظ مستعمل تھا۔ لیکن فیثاغورث کے خیال میں یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو انسان جیسی محدود ہستی کے لائق نہیں۔ البتہ اگر انسان یہ دعوےٰ کرے کہ وہ حکمت کا متلاشی ہے تو یہ اسے ضرور زیبا دیتا ہے اور یہی تلاش یا جذبۂ حصول حکمت ہے جو یونانی زبان میں فیلوسوفیا (تلاش یا اُلفت حکمت) اور فلسفہ کے نام سے موسوم ہوا۔ افلاطون نے اپنی کتاب "فیڈو" میں ذکر کیا ہے کہ سقراط کے مختلف دوستوں میں چند ایسے افراد بھی شامل تھے جو فیثاغورثی حلقے سے تعلق رکھتے تھے اور یہ تعلق کافی قدیم تھا۔ اس واقعہ سے بعض محققین کا خیال ہے کہ فلسفہ کا یہ فیثاغورثی مفہوم سقراط کے ہی ذریعہ ایتھنز میں رائج ہوا۔[۹]

تقریباً اسی دور میں (یا اس سے کچھ پہلے) مغربی ایشیا میں بنی اسرائیل کی ذہنی اور مذہبی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ جب تک یہودیوں کی سیاسی خود اختیاری فلسطین تک محدود رہی ان کے مذہبی تصورات بھی بالکل ابتدائی اور سادہ تھے لیکن بخت نصر سے شکست کھانے کے بعد جب وہ فلسطین سے نکل کھڑے ہوئے اور بعد میں ۵۳۹ قبل مسیح میں ہخامنشی خاندان کے ماتحت انہیں آزادی ملی تو اس تبدیلی سے ان کے مذہبی اور اخلاقی تصورات میں بھی زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہونے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل کے نبیوں نے جو حضرت عیسیٰ کے زمانے تک مختلف وقتوں

---

[۹] ورثۂ یونان صفحہ ۶۰-۶۱

میں پیدا ہوتے رہے بنی نوع انسان کی مذہبی تاریخ پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ توحید کا تصوّر تو کئی قوموں اور کئی ملکوں میں قدیم زمانے سے موجود تھا لیکن خدا کا ایسا تصوّر جس میں نہ صرف یہ کہ اس کا وجود دوسرے دیوتاؤں کے وجود کے منافی ہے بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کا ہر فعل چند بلند اخلاقی اصولوں کے مطابق ہے، جو اس کائنات پر اندھا دھند حکومت نہیں کرتا اور نہ کسی خاص قوم کی طرفداری اور جنبہ داری اس کا شیوہ ہے، یہ تھا وہ اعلیٰ توحیدی تصوّرِ خدا جس پر بنی اسرائیل نے اپنی اخلاقی زندگی کا دارومدار رکھا اور اسی روشنی میں اُنہوں نے کائنات اور انسان کے باہمی رشتے اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس تصوّر میں گہرائی اور وسعت صرف اس وقت پیدا ہوئی جب یہودی بخت نصر کی تباہی کے بعد زرتشتی مذہب و عقاید سے دوچار ہوئے۔ اس امتزاج سے پہلے یہودیوں کے ہاں حیات بعد الموت کا تصوّر یا تو بالکل نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو اس کی نوعیت بالکل قدیم مصری اور بابلی عقاید کے مشابہ تھی۔ اس کے مطابق مرنے کے بعد کسی اجر و سزا کا کوئی امکان نہیں اور نہ انسانی وجود کے تسلسل کا کوئی سوال تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پچھلے کسی مضمون میں بتا چکے ہیں زرتشت کے ہاں یہ تصوّر بہت واضح موجود تھا اور جسکو بعد میں یہودیوں نے اختیار کیا اور ان کے ذریعے عیسائیت اور اسلام میں ظاہر ہوا۔[1] یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سقراط کی پیدائش سے بہت پہلے مغربی ایشیا اور خود یونان کے بہت سے حصہ پر ہخامنشی بادشاہوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ دارا اوّل نے ۵۱۲ قبل مسیح میں ایک شاندار مرکزی نظام قائم کیا جس میں ایران، افغانستان، مغربی پاکستان، ترکستان، شمالی عرب، مصر، قبرص، فلسطین، شام، مغربی ایشیا، مشرقی ایجین، تھریس، مقدونیہ سبھی ممالک شامل تھے۔ یہودی، ہندو، آرمینیا، ترکستان اور ایشیائے کوچک کی یونانی آبادیاں سبھی ایک وحدت میں منسلک تھے اور اس اتحاد اور مرکزی نظام سے تصوّرات اور خیالات کا تبادلہ اسی طرح ایک فطرتی بات ہے جس طرح تجارتی چیزوں کا۔ جدید زمانے کی کھدائیوں سے اس حقیقت کا ثبوت بکثرت ملتا ہے کہ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کے علاقے جہاں یونانی فلسفہ کا آغاز ہوا ایک طرح کی وحدت میں منسلک تھے۔

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہودیوں کے ہاں موت کے بعد بقاءِ شخصی کا تصوّر بالکل موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کے ہاں حشرِ اجسام کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ روحِ انسانی کا بقاء ایک خالص یونانی تصوّر ہے اور اسی ذریعے عیسائیت میں داخل ہوا۔ دیکھئے ورثۂ یونان صفحہ ۵۴ ڈین انج۔ لیکن یہ نقطۂ نگاہ محض مغربی تعصب کی ایک ادنیٰ مثال ہے جو حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ روح کی بقا کا تصوّر زرتشت کے ہاں بالکل واضح شکل میں موجود تھا اور وہیں سے یہودیوں اور یونانیوں نے لیا۔ مغربی مصنّفین کی تمام تر تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ مغربی فکر کا سارا سرمایہ یا تو عیسائیت سے لیا گیا یا یونان سے۔ عیسائیت سے مراد ان کے نزدیک مشرقی عیسائیت نہیں بلکہ ایک خالص مغربی طرز کا عقیدہ ہے جو یہودیت سے بالکل آزاد اور علیحدہ اور یونانیت کے فکری سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے۔ غرضیکہ ان کے خیال میں یورپ کی تمام علمی اور فکری کوششوں کا منبع مشرق میں تلاش کرنا نہ صرف ایک غیر تاریخی عمل ہے بلکہ حق میں باطل کی آمیزش کے مترادف۔

یاورچی خانے کے مختلف ظروف، زیورات، ہتھیار وغیرہ جو ان کھدائیوں سے برآمد ہوئے پتہ دیتے ہیں کہ یونانی، یہودی، ایرانی اور دیگر قومیں ایک ہی طرح کی اشیاء استعمال کرتی تھیں۔ ارسطو کے ایک شاگرد کی روایت ہے کہ جب ارسطو مغربی ایشیا میں پہنچا تو وہاں کم از کم ایک یہودی سے اس کی ملاقات ہوئی جو یونانی زبان سے واقف تھا[1]۔ یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان لڑائیاں ۵۱۲ سے لے کر ۳۲۶ قبل مسیح تک ہوتی رہیں اور اس طرح ان دو قوموں کے درمیان ایک مسلسل داد و ستد کا سلسلہ کافی مدت تک جاری رہا جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایرانی اور اسرائیلی تصوراتِ اخلاق کس حد تک یونانی فلسفۂ اخلاق پر اثر انداز ہوئے اس کا اندازہ لگانے کے لئے آرفیس عقائد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

ان عقائد کا آغاز یونان میں کس زمانے میں ہوا اس کے متعلق کوئی مستند تاریخی روایت موجود نہیں لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح میں شاید مصر یا مشرقی یونان سے کوئی شخص جس کو آرفیس کا نام دیا جاتا ہے ان کو یونان میں لایا۔ وہ بہترین موسیقار تھا اور اس کے چند نغمے چھٹی صدی میں مدوّن ہوئے اور مقدس الہامی سمجھے جانے لگے۔ ان کی بنا پر ایک قسم کا صوفیانہ نظام قائم ہوا جو اگرچہ ڈائونیسس عقائد سے ملتا جلتا تھا لیکن اپنے اخلاقی تصورات اور اعمال کے لحاظ سے اس سے کہیں بلند تھا۔ اس نظام کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا حیات بعد الممات کا واضح تصور تھا جو یونان میں اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک محقق نے ڈائونیسس اور آرفیس کے یونانی تصورات کا یوں مقابلہ کیا ہے: اوّل الذکر مستی، سرور اور مدہوشی کے ذریعے ذات خداوندی سے وصل کے طالب تھے لیکن آرفیس کے پیرو اس مقصد کے لئے پرہیزگاری، تقوےٰ اور ضبطِ نفس کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ یہ دونوں طریقے مسلمان صوفیا کی اصطلاح میں سکر اور صحو سے واضح کئے جا سکتے ہیں۔ سکر کا راستہ ایک طرح کا غیر شرعی طریقہ تھا جس میں مسکرات کا استعمال جائز تھا اور اس طرح وہ لوگوں میں ایک قسم کا مصنوعی جذب پیدا کرتے تھے۔ اس کے دوسری طرف صحو کا راستہ زیادہ مشکل اور ضبطِ نفس اور شریعت و قانون کی پابندیوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہجویری نے کشف المحجوب میں اسی لئے صحو کو سکر پر ترجیح دی ہے۔

یونان کی مذہبی تاریخ میں آرفیس عقاید نے پہلی مرتبہ تبلیغ و ارشاد کا کام شروع کیا۔ جن ملکوں میں شرک و بت پرستی رائج ہو وہاں ایک ہی شہر کے لوگ اکثر اوقات مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں اور کسی کو دوسرے کے خلاف آواز اُٹھانے یا دوسروں کو اپنی طرف دعوت دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکانہ اقوام میں انتہائی رواداری ہوتی ہے۔ ہندوستان میں شو، وشنو اور اندرا وغیرہ کے بے شمار پجاری موجود رہے اور ان میں سوائے بتوں کی پوجا کے اور کوئی قدر مشترک نہ تھا لیکن اس کے باوجود شو کے پجاری کے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہ ہوئی کہ دوسرے دیوتاؤں کے پجاریوں کو اپنے خاص عقائد یا مراسم کی طرف دعوت دے۔ یہی حالت یونان کی بھی تھی۔ لیکن آرفیس کے پیروؤں کے ہاں چونکہ زندگی اور

---

[1] یہودی، ان کی تاریخ، تمدن اور مذہب جلد اوّل صفحہ ۷۵، ۸۲۔

کائنات کا ایک معین نظریہ تھا جس کی بنیاد پر ان کا اخلاق تعمیر ہوتا تھا اس لئے وہ مجبور تھے کہ دوسروں کو اپنے نظریات کے تسلیم کرنے اور ان میں داخل ہونے کی دعوت دیں۔ عام طور پر یونانی مذہبی روایات کسی مقدس کتاب کو تسلیم نہیں کرتیں، لیکن آرفیس کے حامیوں نے جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آرفیس کے نغموں کو ایک خاص دور میں مرتب کیا اور اس کو اپنی الہامی کتاب تسلیم کیا۔ ان کے ہاں کشف اور الہامات کو تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کے اکثر راہنما اسی کشف اور الہام و وحی کی بنا پر اپنے پیروؤں سے احکام کی اطاعت کراتے تھے[1]

ان کے نظریات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسانی روح قدسی صفات کی حامل ہے چونکہ وہ نورِ ازلی کا ایک حصہ ہے۔ یہ روح ابدی بدقسمتی سے مادی جسم میں محصور ہو گئی اور اس طرح اس کی پاکیزگی اور روحانیت میں مادیت کی آمیزش سے اس کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ روح اس صعود سے پہلے ایک روحانی دنیا میں مکین تھی جس کی ہلکی سی جھلک اب بھی ہمیں میسر آ سکتی ہے بشرطیکہ ہم کو اس کی لگن ہو۔ انسان کی زندگی کا واحد مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس مادی آمیزش سے جلد از جلد نجات حاصل کر سکے لیکن اگر وہ چاہے تو اس مادی زندگی کے دوران میں ہی جبکہ اس کی روح اس جسمانی قید میں محصور ہے وہ ان تعینات وحدود کو عبور کر سکتا ہے اور اسی مقصد کے لئے آرفیسی نظام نے چند اخلاقی اصول اور ضبطِ نفس کے چند ضوابط پیش کئے جن کی مدد سے افراد اور اقوام روحانی زندگی کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کی اخلاقی زندگی ایک قسم کی زاہدانہ تھی جس میں یونانیوں کی عام لذت پرستی بالکل مفقود تھی۔ وہ سفید لباس پہنتے تھے، ہر قسم کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے اور بالکل سادہ زندگی بسر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یونانی ذہن اس قسم کے زاہدانہ طریقوں سے بالکل ناآشنا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خالص مادیت پرستی اور لذت کیشی کسی خاص قوم کا اجارہ نہیں اسی طرح زاہدانہ زندگی، نفس کشی اور ریاضت بھی ملکوں اور علاقوں میں تفریق روا نہیں رکھتی۔ اگر یونانیوں کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جسم و روح کی ثنویت اور راہبانہ یا زاہدانہ طرزِ زندگی کے آثار ان کے ہاں شروع سے موجود تھے۔ امپیڈوکلیز کا مشہور قول ہے کہ انسان کائنات کے نور سے جلاوطن ہو چکا ہے۔ اس کا جسم اس کی قبر ہے یا وہ ایک اجنبی مادی قید میں محصور ہے جس سے نجات حاصل کرنا اس کا اولیں فرض ہے۔ یہی ثنویت بعد میں افلاطون اور ارسطو میں بھی موجود ہے جس کو ارسطو نے صورت اور مادہ کا فلسفیانہ لباس پہنا دیا۔ راہبانہ طرزِ زندگی کا پتہ ہومر کے کلام سے ملتا ہے جہاں وہ یونان کے ایسے صوفیا کا ذکر کرتا ہے جو زمین پر سوتے اور ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ عوام میں مختلف دنوں اور مہینوں میں روزے رکھنے کا دستور تھا اور قومی مصیبت کے وقت تمام لوگ مختلف قسم کی ریاضتیں اور روزے

---

[1] اس سلسلے میں سقراط کا دعویٰ کہ اسے غیب کی آواز پہنچتی ہے اور وہ اپنے الہامات اور وحی کی ہدایت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا اسی آرفیسی عقائد کی بازگشت تھی۔

رکھنے کے عادی تھے۔ گوشت سے پرہیز ایک لازمی طریقہ تھا خاص کر اس وقت جبکہ ان کا عقیدہ ہو کہ انسانی روح موت کے بعد اس دنیا میں اپنے اعمال کے مطابق حیوانی شکل میں دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے۔ امپیڈوکلیز کے نزدیک شادی اور اولاد پیدا کرنے سے گریز فلسفیانہ زندگی کے لئے ضروری ہے[۵۱]۔

آرفیسی نظام کا دوسرا اہم پہلو بقائے شخصی کا تصور تھا۔ موت کے بعد ہر انسان کو آئندہ زندگی میں اپنے اعمال کی سزا اور جزا ملتی ہے۔ ایک روایت کے بموجب یہ سزا ابدی اور دائمی ہوگی اور اس طرح جہنّم کا تصوّر پیدا ہوا۔ لیکن دوسری روایت کے مطابق موت کے بعد ایک منزل اعراف کی ہے جہاں انسان عارضی طور پر اپنے بُرے اعمال کی سزا بھگت کر ہمیشہ کے لئے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض جگہ تناسخ کا عقیدہ بھی ملتا ہے[۵۲]۔ ان عقائد کی زرتشتی اور اسرائیلی تصورات سے مناسبت بالکل عیاں اور واضح ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آرفیسی نظامِ اخلاق یا تو اسی سرچشمے سے سیراب ہوا یا بلاواسطہ ایرانی اور یہودی نظریات سے متاثر ہوا۔ مغربی فلسفہ کی کتابوں میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ روح کی بقا کا نظریہ سب سے پہلے سقراط نے پیش کیا تھا لیکن ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بیان بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ افلاطون نے جمہوریت کے دوسرے باب میں ان متصوف لوگوں کا ذکر کیا ہے جو امراء کو گناہ سے پاک کرنے کے لئے ان سے رقمیں اور دعوتیں وصول کرتے تھے لیکن ان مسخ شدہ شکل کے باوجود افلاطون کے ہاں آرفیسی نظریات کا تتبع بالکل عیاں ہے۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفیوں کے پاس آرفیسی صوفیوں کے کئی صحیفے تھے جن کی مدد سے انہوں نے اپنا صوفیانہ نظام تیار کیا[۵۳]۔

سقراط کے زمانہ سے ماقبل یونانی شاعر پنڈار کے اشعار میں آرفیسی نظریۂ حیات بعد الموت کا ذکر ملتا ہے اور بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مغرب کی شاعری کی تاریخ میں شاید پنڈار پہلا شاعر ہے جس کے ہاں فردوس اور جنّت کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ہاں انسانیت کا نورِ ازلی سے پیدا ہونے کا نظریہ بھی ملتا ہے جو آرفیسی صوفیا کا ایک بنیادی عقیدہ تھا۔ ڈرامہ نویسوں میں سے ایسچیلس اور سوفوکلیس کے ہاں اس قسم کے نظریات نہیں ملتے مگر یوروپڈیز کی کتابوں میں پھر آرفیسی نظریۂ حیات کی جھلک بالکل نمایاں ہے۔ ایتھنز میں اس کی صحبت انکساغورس، پروٹیگورس اور سقراط جیسے بلند پایہ مفکّرین کے ساتھ رہی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یونان کی قدیم مذہبی روایات سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کے ہاں خدا کا تصوّر مشرکانہ آمیزشوں سے کافی حد تک پاک ہو چکا تھا۔ یونانیوں کے ہاں یہ عام تصوّر تھا کہ دیوتا انسانوں کی خوشحالی کو برداشت نہیں کر سکتے اور اگر کوئی انسان زندگی کی آسائشوں اور مادی فوائد کی کثرت سے بہرہ مند ہو رہا ہو

---

۵۱ سقراط کی زندگی اسی قسم کی زاہدانہ تھی جس کی تفصیلات بعد میں اپنی جگہ بیان ہوں گی۔

۵۲ محققین کا خیال ہے کہ یہ تصوّرات بدھ مت کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق جلد ۶ صفحہ ۳۰۸

۵۳ یونان کی زندگی، صفحہ ۱۴۲، ورثۂ یونان صفحہ ۵۳، ۴۵، ۴۶۔

تو اس وقت یقینی ہے کہ دیوتا کسی نہ کسی شکل میں اس پر کوئی نہ کوئی عذاب نازل کرینگے۔ یوروپڈیز نے اس بے ہودہ تصوّر پر تنقید کی اور کہا کہ خدا کے ساتھ ایسے معاندانہ جذبات کو منسوب کرنا انتہائی ذلیل حرکت ہے۔ اسی طرح یونانی صنمیات میں دیوتاؤں اور دیویوں کے عشق و ہوسناکی کی داستانوں کے خلاف بھی اس نے پُر جوش احتجاج کیا۔ اس طرح اس نے خدا کے تصوّر کو اس بلندی اور پاکیزگی تک پہنچا دیا جو اسرائیلی نبیوں کے ہاتھوں عمل میں آچکا تھا اور ناقدین کا خیال ہے کہ یوروپڈیز اس معاملے میں یہودی تصورات سے متاثر تھا[1] جو یونان میں آرفیسی عقاید کی وجہ سے پھیل چکے تھے۔ آہستہ آہستہ زندگی اور کائنات کا تصوّر محض خارجی اور مادی ہونے کی بجائے داخلی اور روحانی ہوتا گیا خدا کے تصوّر میں یہ عقیدہ بھی شامل ہوگیا کہ وہ انسانوں کے ظاہری اعمال کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دل کی گہرائیوں سے بھی واقف ہے اور موت کے بعد سزا اور جزا کا انحصار انسان کی نیت اور عمل دونوں پر ہوگا۔ اس طرح ایک بلند قسم کا مذہبی ماحول پیدا ہونا شروع ہُوا۔

اس کے علاوہ یوروپڈیز کے ہاں ہمیں یونان کی تاریخ میں پہلی بار نسلی اور قومی حدود سے بلند ہونے کا تصور ملتا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سکندر کی موت کے بعد جب یونان کی سیاسی زندگی ختم ہوگئی تو رواقیین نے بین الاقوامیت کا تصور پیش کیا حالانکہ اس سے پہلے یونانیوں کے ہاں ایک نسلی و ملکی تعصب کا بہت چلن تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت پہلے یوروپڈیز نے اس تعصب کے خلاف آواز بلند کی تھی اور اس کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ " ایک نیک آدمی کے لئے خدا کی زمین کا ہر حصہ اس کا وطن ہے"۔

ان افکار کے ساتھ ساتھ خالص فلسفیانہ تصورات بھی صورت پذیر ہوتے رہے۔ جب سقراط کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی اس وقت یہ تصورات دو مختلف مرکزوں سے وابستہ ہو چکے تھے۔ ایک طرف ایشیائی مرکز تھا جہاں کے مفکرین نے کائنات کی گتھی سلجھانے کے لئے وحدت خالصہ کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے نزدیک تمام اشیاء ایک بنیادی جزو سے ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ بنیادی چیز ان کے نزدیک "ہوا" تھی جس سے ان کی مراد بخارات ہے۔ ہوا کی مختلف حالتوں، انجماد اور حرارت سے مختلف چیزیں پیدا ہوئیں۔ انسانی روح بھی یہی ہوا ہے جو ہم ماحول سے سانس کے ذریعے اندر لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احساس خودی اور زندگی کا سارا دارومدار ہمارے سانس لینے پر ہے، جونہی ہمارا سانس لینا بند ہوتا ہے ہماری روح جسم سے پرواز کر جاتی ہے اور انسان مرجاتا ہے۔ یہ زمین جس پر ہم بستے ہیں اسی ہوا کی انتہائی انجمادی حالت کا نام ہے اور ہوا پر اس طرح گردش کرتی ہے جس طرح پتہ ندی کے پانی پر۔ ان کے نزدیک زمین چپٹی تھی۔ دوسرا مرکز ان یونانی آبادکاروں کا تھا جو اٹلی کے جنوب میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں وحدت کی بجائے کثرت پر زیادہ توجہ کی گئی۔ ان کا نمائندہ ایمپیڈ دکلیز تھا۔

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا اخلاق و مذہب، صفحہ ۴۱۵ ب

اس کے نزدیک کائنات کی تکوین چار مختلف اجزاء سے ہوئی، آگ، ہوا، پانی اور مٹی ان کے خیال میں زمین مدور تھی
ان متضاد تصورات وعقائد کی ترویج سے لوگوں میں ایک ذہنی الجھاؤ پیدا ہو چکا تھا اور عوام کے دلوں میں اپنی قدیم روایات اور مذہبی عقائد سے وابستگی کم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اس ذہنی طوائف الملوکی میں پارمینائڈیز اور اس کے شاگرد زینو کی عقلی تنقید نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ انہوں نے منطقی اصول تضاد کی بنا پر حرکت اور تبدیلی کے وجود سے مطلق انکار کر دیا ان کا مقولہ تھا کہ ہر وہ چیز یا تصور جس میں تضاد پایا جائے کبھی حقیقت نہیں ہو سکتی اور چونکہ حرکت کا تصور جس کا تجربہ ہمیں حواس کے ذریعے ہوتا ہے اور حس کی اصلیت سے انکار ممکن نہیں اسی عقلی تضاد سے متاثر ہے اس لئے نہ صرف یہ کہ حرکت اور تبدیلی غیر حقیقی ہے بلکہ اس معاملہ میں حواس پر اعتماد کرنا ہی غلط ہے۔ چونکہ خارجی کائنات اور فطرت میں ہر جگہ تبدیلی نمایاں ہے اس لئے یہ خارجی دنیا محض دھوکا اور مایا ہے حقیقت مطلقہ واحد ساکن اور جامد ہے۔ اس عقلی تنقید سے لوگوں کے دلوں میں بجا طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ کائنات کے متعلق کسی صحیح علم کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ایسے ہی حالات تھے جن سے متاثر ہو کر سقراط کے ہمعصر مفکرین نے اپنی تمام تر توجہ کو آفاق سے ہٹا کر انفس کی طرف مبذول کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر حقیقت کا مشاہدہ خارجی کائنات کے مطالعہ سے ممکن نہیں تو شاید انسان کی داخلی کائنات، اس کی روح اور نفسیاتی زندگی کے تجزئے سے وہ گوہر مقصود حاصل کر سکیں۔ ان مفکرین میں سب سے زیادہ مشہور پروٹیگورس تھا جو سوفسطائی گروہ کا بلند پایہ نمائندہ کہلاتا ہے۔ جب عقلی تنقید سے قدیم روایات اور عقائد کی بنیاد متزلزل ہو چکی ہو تو اس وقت اخلاقی تقاضا یہی مطالبہ کرتا ہے کہ لوگوں کو نئے پیمانوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا جائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی کا خلا پورا کر سکیں۔ سوفسطائی گروہ اسی نئے رجحان کا آئینہ دار تھا۔ لفظ سوفسطائی افلاطون کی تنقید کے بعد بالکل بُرے معنوں میں مستعمل ہونے لگا اگرچہ اس کا لغوی مفہوم معلم حکمت تھا اور وہ لوگ جو سوفسطائی تھے سوائے چند کے بہت بلند پایہ حکیم تھے حتیٰ کہ خود افلاطون بھی پروٹیگورس کو ایک بلند مرتبہ انسان و مفکر کہنے پر مجبور ہے یہ پروٹیگورس ہی تھا جس نے سقراط سے پہلے لوگوں کی توجہ خارجی کائنات کے مسائل سے ہٹا کر انسان کی نفسیاتی زندگی کے مدوجزر کی طرف مرکوز کی۔ اس نے انسانی حواس کی بنیاد پر حاصل کردہ علم کو صحیح تسلیم کیا اور اس طرح پارمینائڈز کے منطقیانہ رجحان کے سدباب کرنے کا ذریعہ بنا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اخلاقی دنیا میں اضافیت اقدار کا نظریہ پیش کیا۔ صداقت، نیکی اور خوبصورتی کوئی مستقل بالذات، معروضی یا حقیقی اقدار نہیں بلکہ زمانے، وقت، مکان، ماحول کے تقاضوں سے ان کے مضمرات بدلتے رہتے ہیں۔ صحیح اور پائدار، مستقل اور دائمی معیار اقدار تو خود انسان ہے۔ ہر وہ چیز تصور یا قدر جو اس کے جبلّی تقاضوں یا وقتی رجحانات کو پورا کرے وہی بہتر اور صحیح ہے اور یہی اس کی بھلائی اور برائی کا آخری اور قطعی معیار۔ ایک دن ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے پروٹیگورس نے یہ کہہ دیا کہ میں نہیں جانتا کہ دیوتا موجود ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو ان کی صحیح ماہیت کیا ہے" ایسے علم کی تحصیل میں کئی رکاوٹیں ہیں معاملہ خود غیر واضح ہے اور انسانی زندگی کی مدت بالکل محدود۔ جب لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے پروٹیگورس کا ایتھنز میں رہنا پسند نہ کیا اور اسے مجبوراً شہر چھوڑ کر جان بچانی پڑی۔

اس گروہ کے بعض مفکرین کی عظمت کو مانتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تعلیم سے یونان کی ذہنی زندگی میں ایک بہت خوفناک انقلاب پیدا ہو گیا۔ پرانے تصورات اور عقائد ان کی عقلی تنقید کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے لیکن اس تخریبی عمل کے بعد ان کے ہاتھوں کسی تعمیر کا سنگ بنیاد نہ رکھا جا سکا اور اس لئے افلاطون نے ان کے کام پر بہت زبردست تنقید کی۔

جمہوریت میں اس نے سوفسطائی اساتذہ کی مثال ایک ایسے شخص سے دی ہے جس نے تجربہ سے ایک خوفناک وحشی جانور کی عادات اور ضروریات کا علم حاصل کر لیا ہو، جس کو معلوم ہو چکا ہو کہ کب اس کے نزدیک آنا مناسب ہے، کون سی آواز سے وہ جانور طیش میں آتا ہے اور کون سی آواز سے وہ سکون حاصل کرتا ہے، اور اس کی مختلف آوازوں کا کیا مفہوم ہے۔ اس علم کے حاصل کرنے کے بعد اس نے اس کو حکمت کا نام دینا شروع کیا اور دوسرے لوگوں کو اس کی اہمیت جتا کر ان کو اس کے سیکھنے کی ترغیب دی۔ ہر وہ چیز یا فعل جس سے وہ وحشی جانور خوش ہوتا ہو اس کے نزدیک صحیح اور درست ہے اور ہر وہ چیز یا فعل جس سے وہ ناخوش ہو، غلط اور نادرست اگرچہ وہ اس سے بالکل ناواقف ہے کہ اس کے کون سے افعال حقیقی طور پر صحیح ہیں اور کون سے غلط۔ یہی حالت افلاطون کے خیال میں سوفسطائیوں کی ہے جو عوام کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پوری کرنے کو ہی اخلاقی عمل قرار دیتے ہیں۔

ایسے ماحول میں سقراط نے اپنی فکری زندگی کا آغاز کیا اور حالات کے مطابق اس کی پہلی توجہ خارجی کائنات کے مسائل کی طرف رہی۔ افلاطون نے اپنی کتاب 'فیڈو' میں سقراط کی ذہنی تاریخ اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کی ہے "جب میں جوان تھا تو مجھے اس حکمت کے حصول کا بے حد ولولہ تھا جس کو علم طبیعی کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہر چیز کی علت معلوم کرنا ایک بلند ترین مشغلہ تھا ـــ ایک چیز کیوں اور کیسے وجود میں آتی ہے، کیوں فنا ہوتی اور کیوں قائم رہتی ہے؟ میرے ذہن میں ہر وقت یہ سوال پیدا ہوتے رہتے ـــ کیا جاندار چیزوں کی ہیئت سردی اور گرمی کی ایک متناسب آمیزش سے معرضِ وجود میں آتی ہے؟ کیا ہماری قوت عقلیہ خون، ہوا، یا آگ کے باعث ہے؟ یا کیا ان میں سے کوئی چیز بھی اس قوت کی حقیقی علت نہیں بلکہ ہمارا ذہن ہے جس سے ہمیں شنوائی، بینائی اور سونگھنے کی حس پیدا ہوتی ہے؟ ان کے علاوہ میں مختلف اشیاء کے فنا ہونے اور آسمان اور زمین کی تبدیلیوں پر غور کیا کرتا حتیٰ کہ میں ایک دن اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں ایسے مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان کی کنہ تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ان علوم کے مطالعے نے مجھے اتنا اندھا کر دیا کہ میں ہر اس علم کو بھول گیا جو مجھے ان اشیاء کے متعلق پہلے معلوم تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں بھول گیا بلکہ مجھے بہت کچھ بھلانا پڑا۔ مثلاً ایک انسان کی جسمانی نشو و نما کے متعلق میرا یقین تھا کہ غذا کے باعث ہمارے گوشت پوست اور ہڈیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب میں کسی لمبے اور چھوٹے قد کے آدمیوں کو دیکھتا تو مجھے یقین تھا کہ ایک دوسرے سے ایک انچ یا چار انچ بڑا ہے ..... لیکن اب یہ حالت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی صحیح علت کا مجھے یقین نہیں رہا۔ اگر ایک میں ایک جمع کیا جائے تو مجھے یقین نہیں کہ وہ ہندسہ ایک جس میں دوسرا ہندسہ ایک جمع کیا گیا ہے دو بن جاتا ہے یا نہیں۔ اب میں نہیں سمجھ سکتا

کہ جب ایک میں ایک جمع کیا جائے تو کیسے وہ دونوں مل کر دو بن جاتے ہیں۔[۵]

میں اس ذہنی کش مکش اور اُلجھن میں مبتلا رہا۔ ایک دن میں نے ایک شخص کی زبان سے سنا کہ اس نے انکساغورس کی کتاب پڑھی جس میں مذکور تھا کہ کائنات کی ہر چیز کی علّت غائی اور ان میں ترتیب و انتظام پیدا کرنے والا نفس ہے۔ یہ سُن کر مجھے کچھ تشفی سی ہوئی اور مجھے محسوس ہُوا کہ نفس کا علّتِ غائی ہونا صحیح ہے کیونکہ اگر کائنات کا تمام نظام نفس کے ہاتھوں میں ہے تو یقیناً یہ نظام بہترین ہوگا۔ پس اگر ہم کسی شے کی پیدائش یا فنا یا وجود کی علت معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس شے کے وجود، عمل اور معمول کا بہترین طریقہ کون سا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ سوچے کہ اس کے لئے کون سا طریقہ بہترین ہے اور اسی سے مستنبط ہوگا کہ وہ بُری چیزوں سے واقف ہو جائے گا۔ میں ان باتوں کو سوچ کر بہت خوش ہُوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ انکساغورس کا یہ اصول تشریح علل اشیا میرے ذوق و مزاج کے مطابق ہے۔ مجھے توقع پیدا ہوئی کہ وہ بتا سکے گا کہ آیا زمین گول ہے یا چوڑی چپٹی۔ پھر علّت و ضرورت کی تشریح ہوگی اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ کونسی چیز بہترین ہے اور یہ کہ جو شکل بھی زمین کی ہے وہ بہترین ہی ہوگی ...... اس طرح میرے ذہن میں سورج، چاند، سیاروں، ان کی گردش اور مختلف رفتاروں کے متعلق کئی سوالات پیدا ہوئے اور مجھے یہ توقع تھی کہ انکساغورس کے ہاں ان تمام چیزوں کے متعلق ان کے مختلف اعمال کی وجوہات کی تشریح ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہر ہر چیز کی علّت اور پھر تمام کائنات کی علت بیان کرنے کے بعد تفصیل سے اس چیز کی بحث کرے گا کہ ہر ایک کے لئے کیا بہترین منزل و مقصد ہے۔ اور وہ کس بلند مقصد کے لئے عالم وجود میں آئی۔ ان مختلف تصوّرات و توقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس کی کتابوں کا مطالعہ بہت ذوق و شوق سے شروع کیا۔ تاکہ معلوم کرسکوں کہ بہترین اور بدترین لائحہ عمل کیا کیا ہیں۔ لیکن اے میرے دوست میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں جب میں نے دیکھا کہ مصنّف نے نفس کا ذکر تو ضرور کیا ہے لیکن سوالات اور مسائل کے حل میں اس نے اس اصول کو استعمال نہیں کیا اور نظامِ کائنات کی تشریح میں کوئی علّت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جن علتوں کا ذکر کیا وہ وہی تھیں جو ان فلاسفہ نے استعمال کی تھیں جو اس سے ماقبل موجود تھے (اور جن کو مادیین کہا جاتا ہے)، مثلاً ہوا، ایتھر، پانی وغیرہ ......" اس مایوسی کے بعد سقراط نے فیصلہ کیا کہ علم طبیعات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا حالات کی نزاکت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مناسب نہ ہوگا۔ لوگوں میں ذہنی طور پر ایک ایسی بے راہ روی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی اصول پر اتفاق ممکن نہیں، لوگوں کے دلوں میں نیکی اور بدی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کی اہمیّت ختم ہو چکی ہے۔ پُرانے عقائد اور قدیم روایات اپنی قیمت کھو بیٹھے ہیں۔ اس لئے سقراط نے فیصلہ کیا کہ طبعی مسائل کو ترک کر کے خالص نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس عبوری دور میں لوگوں کے ذہن صاف ہوسکیں۔ متعدد تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا

---

[۵] ان فقرات میں سقراط اپنے زمانہ کے طبعی فلاسفہ کے اختلافات اور زینو کی مشہور ریاضیاتی متضادیات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ہے کہ سقراط اپنے عصری تقاضوں سے مجبور ہو کر دونوں قسم کی تحریکوں میں شامل تھا۔ وہ خالص طبعی اور مابعد الطبیعی مسائل میں بھی اسی طرح انہماک رکھتا تھا جس طرح اخلاقی اور مذہبی مسائل میں اور اس کی شہرت بہ حیثیت ایک حکیم کے کافی دور دراز تک پہنچ چکی تھی۔ ایک روایت کے بموجب سقراط ایک طرح کی صوفیانہ جماعت کا سردار بھی تھا جہاں علم و حکمت کے علاوہ عملی زاہدانہ زندگی بسر کی جاتی تھی اور جہاں انسانی روح کے متعلق عجیب و غریب قسم کے نظریات کا درس دیا جاتا تھا۔ عجیب و غریب اس لئے کہ اس زمانے میں یونانیوں کے ہاں روح کے متعلق کوئی تصوّر موجود نہ تھا اور جو کچھ تھا وہ محض مادی نظریات کی پیداوار تھی۔ زینوفون کی روایت کے مطابق ایتھنز میں ایک سوفسطائی اینٹی فون نے سقراط کے اس حلقے کے خلاف ایک طرح کا قلمی جہاد کر رکھا تھا اور سقراط کے کئی شاگردوں کو اس حلقے سے توڑنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ ان اعتراضات میں سے چند یہ تھے کہ ان لوگوں کی اور خاص کر سقراط کی زندگی ایسی زاہدانہ تھی کہ شاید غلام بھی اس کو پسند نہ کریں۔ وہ ایک ہی کوٹ گرمیوں اور سردیوں میں پہنتا جو بالکل پھٹا ہوا ہوتا۔ اس کے گلے میں قمیص ہوتی نہ پاؤں میں جوتی۔ اس حلقے کی زندگی کا نقشہ زینوفون نے سقراط کے الفاظ میں یوں کھینچا ہے: "میں اور میرے رفیق مل کر قدیم علماء و حکماء کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ان حکمت کے خزانوں میں سے ہم گہر ہائے نایاب حاصل کرتے ہیں اور آپس میں غور و فکر سے ان کے مطالب سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں"[1] مغربی مورخین فلسفہ نے سقراط کی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کتابیں کون سی تھیں؟ انسائیکلوپیڈیا مذاہب اور اخلاق نے جو عبارت زینوفون سے نقل کی ہے اس میں الفاظ "ذخائر حکمت جو پاپیریس مجلدات میں مندرج تھے" موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مصری حکماء یا فیثا غورث کی تصانیف ہوں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اسرائیلی انبیاء کے صحیفے ہوں؟ چونکہ مغربی مصنّفین کی کوشش یہی رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ سقراط نے اپنی حکمت و دانائی کو بلا واسطہ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور وہ اپنے کسی پیشرو سے کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوا تھا اسی لئے انہوں نے اس معاملے میں اکثر سکوت اختیار کیا ہے۔ لیکن سقراط کی زندگی کے ایک دوسرے واقعے سے جس کی طرف افلاطون کی کتابوں میں بھی اشارات موجود ہیں یہ تصدیق ہوتی ہے کہ سقراط محض ایک فلسفی نہ تھا بلکہ وہ الہام سے بھی نوازا گیا تھا اور اس کی قلبی واردات محض ایک خشک فلسفی کی سی نہ تھیں بلکہ اس میں کشف و وجدان، الہام و نبوت کی پوری آمیزش تھی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم شہادت جو ہمیں ملتی ہے وہ سقراط کا نظریۂ توحید ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں لفظ "خدا" جمع کی حالت میں ملتا ہے لیکن جہاں کہیں اس نے "دیوتاؤں" کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس سے مراد عوام کے مشرکانہ معتقدات کی تشریح ہے اور ان کے نظریات کی ترجمانی ہے۔ لیکن جہاں سقراط صرف اپنے ذاتی رجحانات کا ذکر کرتا ہے وہاں وہ لفظ

---

[1] مدنیت یونان صفحہ ۴۷، انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق جلد ۱۱ صفحہ ۶۲۹ ب۔

خداواحد میں استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر زیلر نے اپنی کتاب سقراط اور سقراطی مکتبِ فکر میں اس چیز کو تسلیم کیا ہے کہ اگرچہ سقراط سے پہلے یونانیوں کے ہاں توحید کے دھندلے تصورات موجود تھے لیکن سقراط ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے کثرت پرستی اور شرک کے خلاف خدائے واحد اور توحید کا خالص تصوّر پیش کیا[1]۔ افلاطون کی ایک کتاب "ایتھی فرون" میں سقراط خود بیان کرتا ہے کہ اس کے نزدیک یونانی صنمیاتی کہانیاں جن میں دیوتاؤں کے قصے موجود ہیں بالکل لغو بے معنی اور غلط ہیں اور اس نے کثرت پرستی اور شرک کے خلاف جو جہاد جاری کیا اس کے باعث عوام اس سے بہت ناراض ہیں۔

عام طور پر سقراط کی زندگی کے وجدانی پہلو پر بہت کم توجہ کی گئی ہے لیکن درحقیقت یہی ایک پہلو ہے جس سے یونانی فلسفے کی خالص عقلیت کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب "سیمپوزیم" میں سقراط کے اس پہلو پر اس کے ایک دوسرے شاگرد السیبیڈیز کی زبانی کافی روشنی ڈالی ہے۔ السیبیڈیز بیان کرتا ہے کہ سقراط کے الفاظ میں وہ سحر اور جادو ہے جو کسی موسیقار کے گانے میں بھی نہیں۔ جو شخص بھی اس کی باتوں کو بلا واسطہ یا بالواسطہ سن پاتا ہے اس کا دل بے قابو ہو جاتا ہے اور اثر لئے بغیر نہیں رہتا۔ "میرا دل اُچھلنے لگتا ہے اور میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں۔ اور یہ حالت صرف میرے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر شخص کا تجربہ بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے پیریکلیز اور دوسرے خطیبوں کی باتیں سُنی ہیں اور اگرچہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تقریریں بہت بلند اور شاندار ہوتی تھیں، لیکن ان کے سننے سے میرے دل کی یہ حالت نہ ہوتی تھی۔ نہ میری روح میں کوئی ارتعاش پیدا ہوتا اور نہ مجھے اپنی اخلاقی کم مائیگی کا کبھی احساس پیدا ہوتا۔ لیکن اس سقراط نے میری ذہنی حالت میں اتنا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ میں اپنی موجودہ طرزِ زندگی کو کسی حالت میں برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اگر میں اپنے کانوں کو اسکے الفاظ سننے سے بند نہ کروں اور اس سے دور بھاگنے میں کامیاب نہ ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی ساری عمر اس کے پاؤں سے وابستہ ہو کر گزار دوں، کیونکہ اس کی موجودگی اور اس کے الفاظ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی اس نہج پر نہیں گزارنی چاہئے، مجھے اپنی روحانی زندگی سے بے اعتنائی نہیں برتنی چاہئے اور اپنے اہلِ شہر کے فلاح و بہبود میں منہمک رہنا چاہئے۔ یہی ایک شخص ہے جو میرے دل میں ندامت اور شرم کا احساس پیدا کرتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں، نہ یہ جرأت ہے کہ میں کہہ سکوں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ مجھے نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن جب میں اس کی مجلس سے اُٹھ جاتا ہوں تو دنیا کی شہرت کا جذبہ میرے دل پر قابو پا لیتا ہے اور میں پھر اس دلدل میں پھنس جاتا ہوں جس سے نکالنے

---

[1] سقراط اور سقراطی مکتبِ فکر، صفحات ۱۷۵-۱۷۶۔ اس کے علاوہ دیکھئے صفحہ ۱۷۶ فٹ نوٹ ۳ جہاں ڈاکٹر زیلر نے ایک ناقد کی رائے کی تردید کی ہے۔ اس ناقد کا کہنا یہ تھا کہ سقراط نے اپنے زمانے کے مشرکانہ عقائد کو عوام کے لئے رہنے دیا حالانکہ وہ خود توحید کا قائل تھا۔ ڈاکٹر زیلر کا خیال ہے کہ یہ نظریہ سقراط کی زندگی کے عام رجحان اور مسلک کے خلاف ہے۔ جس چیز کو سقراط نے صحیح پایا اس نے بلا لومۃ لائم اس کی تبلیغ کی۔

کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔"[1] اس کے بعد وہ سقراط کی غیر معمولی جسمانی اور ذہنی قوتِ برداشت کی مثالیں دینے کے بعد ایک عجیب وغریب واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ سقراط ایک مسئلے پر غور وفکر کر رہا تھا اور اس کا کوئی حل اس کے ذہن میں نہ آیا۔ اس سوچ میں وہ ایک جگہ کھڑا تھا، صبح سے دوپہر ہوگئی اور وہ اپنی جگہ بالکل ساکن دیا مد کھڑا رہا۔ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی اور وہ اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے لیکن سقراط اس تمام ماحول سے بے خبر وہیں کھڑا رہا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز و بے خبر ہے۔ لوگ بیٹھے رہے، رات آئی اور گزر گئی اور وہ وہاں بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا، صبح ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے ہلا، سورج کے رُخ پر اس نے نماز ادا کی اور اپنے راستے پر ہولیا۔[2] یہ تمام واقعات صاف صاف اس چیز کی غمازی کرتے ہیں کہ سقراط کی زندگی محض خشک عقلی فلسفی کی سی نہیں تھی بلکہ اس میں قلبی واردات وکشف و وجدان کا پورا حصّہ شامل تھا۔

"اپالوجی" میں افلاطون نے سقراط کی زندگی کے ایک اور دلچسپ پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط کے سامنے اپنی قوم کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کی اصلاح کا ایک مثبت اور ایجابی پروگرام تھا جس کی ابتدا ایک معمولی واقعہ سے ہوئی۔ سقراط کے ایک شاگرد نے اپالو دیوتا کے مندر کی ایک کاہنہ سے سوال کیا: کیا اس وقت سقراط سے بڑھ کر کوئی دانا حکیم موجود ہے؟ کاہنہ نے جواب دیا کہ نہیں۔ اب سقراط کے سامنے ایک عجیب الجھن تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دانا نہیں اور کاہنہ کا جواب بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اس تضاد کو کیسے رفع کیا جائے؟ اس الجھن کو حل کرنے کے لئے اس نے مختلف آدمیوں سے ملنا شروع کیا جو اپنی دانائی کیلئے مشہور تھے۔ سب سے پہلے وہ ایک سیاست دان کے پاس پہنچا۔ لیکن گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ اکثر لوگ اور وہ خود بھی اس وہم میں مبتلا تھے کہ وہ دانا ہے لیکن درحقیقت وہ دانائی سے کوسوں دور تھا۔ اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "میں اس سے زیادہ دانا ہوں، ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ نیکی کیا ہے لیکن وہ نہ جانتے ہوئے اس خیال کو دل میں جگہ دئے ہوئے ہے کہ وہ جانتا ہے اور میں نہ جانتے ہوئے اپنی جہالت سے پوری طرح واقف ہوں۔" اس طرح وہ کئی آدمیوں سے ملتا رہا لیکن اگرچہ اس کام کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے دشمن ہوگئے تاہم اس کے سامنے (اس کے اپنے الفاظ میں) خدا کا فرمان سب سے بالا تھا اور وہ ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھا کیونکہ خدا کے حکم کی تابعداری اس پر فرض تھی۔ اس نے شاعروں اور کاروباری آدمیوں، کاریگروں سب کو ٹٹولا لیکن نتیجہ ہر حالت میں وہی تھا۔ اس تفصیل کے بعد اس کے تاثرات کو میں اس کے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں: "اس مسلسل بحث و مکالمات سے بہت سے لوگ میرے خلاف ہوگئے اور ان کے دل میں میرے متعلق نفرت و بغض و حسد کے جذبات پیدا ہوگئے۔ انہوں نے میرے خلاف غلط الزامات اور تہمتیں تراشنی شروع کیں۔ مجھے طبعی فلسفی (مادیت پرست) اور سوفسطائی کے لقب

---

[1] افلاطون کی کتاب سیمپوزیم صفحات ۳۴۶-۹، ترجمہ جویٹ، نیویارک (ایک ہی جلد میں)
[2] ایضاً صفحہ ۳۵۴

دیئے گئے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی میں نے لوگوں کے دعوائے دانائی کی قلعی کھولی تو سننے والوں نے عموماً یہی تأثر لیا کہ میں ان معاملات میں ان سب سے زیادہ دانا ہوں لیکن میرے دوستو، میرا یقین ہے کہ صرف خدا ہی دانا و حکیم ہے اور اس کاہنہ کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے ہیں ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسانوں کا دانائی کا دعویٰ بے معنی ہے۔ ان الفاظ کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ سقراط دانا ہے۔ اس نے صرف میرے نام کو بطور مثال استعمال کیا گویا کہ کہنا یہ تھا کہ تم میں سے صرف وہی شخص دانا ہے جو سقراط کی طرح جانتا ہو کہ دانائی اور حکمت کا دعوئے ہیچ ہے۔ اس لئے میں اب بھی لوگوں سے ملتا اور گفتگو کرتا ہوں تاکہ خدا کے حکم کے مطابق میں اس کی عقلی حیثیت کا مطالعہ کرسکوں۔ جہاں کہیں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص دانا نہیں تو میں خدا کی طرف سے اس کو سمجھاتا ہوں کہ وہ دانا نہیں۔ میں اس فرض میں اتنا منہمک ہوں کہ میرے پاس سیاسی اور انتظامی امور میں دخل دینے یا اپنے خانگی اور نجی معاملات کی طرف توجہ کرنے کا کوئی وقت نہیں۔ میں خدا کی خدمت کے سرانجام دینے کے باعث غربت و افلاس کی انتہائی حالت میں مبتلا ہوں۔"[۵]

اس تمام بیان سے ایک چیز واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا کے لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی حقیقی فلاح و بہبود، اپنی روحانی زندگی کے تقاضوں، اپنے اخلاقی فرائض سے بالکل بے پروا اور جاہل ہیں۔ نہ صرف جاہل بلکہ ان کی اہمیت سے بھی بے خبر ہیں۔ سقراط کی برتری اس میں مضمر ہے کہ وہ ان دونوں حقیقتوں سے پوری طرح باخبر ہے اور اس کی زندگی کا مقصد وحید یہی ہے کہ لوگوں کو بلند اخلاقی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دے۔ سقراط نے دعوئے کیا ہے کہ اسے اس فرض پر خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے اور اس نے ہمیشہ اس کی ادائیگی میں پوری پوری کوشش کی۔ اپالوجی کے مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ سقراط کی صحیح پوزیشن ایک فلسفی سے بڑھ کر ایک ہادی اور مامور من اللہ کی ہے۔ اس کی تائید میں میں اپالوجی سے مختلف اقتباسات پیش کرتا ہوں:

"جو کچھ بھی انسان کا فرض ہو، خواہ اس نے اسے خود اپنی مرضی سے اختیار کیا ہو یا اس کو اس کا حکم دیا گیا ہو اس کی ادائیگی ضروری ہے خواہ اس میں جان کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ ایسے حالات میں یہ بات کتنی بری ہوگی کہ میں موت کے ڈر سے اپنے فرض سے روگردانی کروں جیساکہ میرا یقین ہے کہ خود خدا نے مجھے یہ فرض سونپا ہے کہ میں اپنی ساری زندگی حکمت کی تلاش میں صرف کردوں اور اس مقصد کے لئے اپنے اور دوسروں کے دلوں کو ٹٹولتا رہوں۔" (۲۸-۲۹)

"اے ایتھنز کے باشندو! تمہاری قدر و منزلت میرے دل میں بہت ہے۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے مقابلے پر میں خدا کے حکم کی تعمیل کرنے کو ترجیح دوں گا۔ جب تک میری جان میں جان ہے میں حکمت سے اور تمہیں راستی کے طریقے پر چلنے کی ہدایت کرنے سے کبھی باز نہیں آسکتا۔ میں آخر دم تک تمہیں یہ کہتا رہوں گا، کیا تم دولت، عزت اور

---

[۵] افلاطون کی کتاب "اپالوجی" ۲۳

شہرت حاصل کرنے سے باز نہیں آؤ گے اور کیا حکمت، صداقت اور اپنی روحوں کی تکمیل کے جذبات تمہارے دلوں میں پیدا نہ ہونگے؟ ...... یہ میں ہر شخص سے کہتا رہوں گا، وہ جوان ہو یا بوڑھا یا بچہ یہ سمجھ رکھو کہ خدا نے مجھے یہ کام کرنے کا حکم دیا ہے۔" (۲۹-۳۰)

"اگر تم نے مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیا تو تمہیں میرے جیسا انسان آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ خدا نے مجھے اس شہر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ تم یوں سمجھو کہ یہ شہر گویا ایک بہترین نسل کا گھوڑا ہے جو بدقسمتی سے سستی اور کاہلی کا شکار ہو چکا ہے۔ میرا کام اس مکھی کی طرح جو اسے ہر طرف سے کاٹتی اور ستاتی ہے تاکہ اسے حرکت کرنے پر مجبور کرے۔ میں ہی وہ مکھی ہوں جسے خدا نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔"

"یہ یاد رکھو کہ یہ خدا ہے جس نے مجھے تمہارے شہر میں بھیجا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرو کہ یہ فرض میں نے خود اپنے ذمے لیا ہے تو تم خوب سمجھ سکتے ہو کہ کوئی انسان کبھی محض اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جس سے اس کے مفادات کو نقصان پہنچے۔ مثلاً میں نے جب سے اس فرض کی ادائیگی کا کام شروع کیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک میرے تمام معاملات خراب ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے تمام نجی کاموں سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت تم لوگوں کو راہِ ہدایت کی طرف ترغیب دینے میں صرف کر دیا ہے۔ میں نے یہ فرض ایک بڑے بھائی یا باپ کی حیثیت سے سرانجام دیا ہے۔ کیا مجھے اس کام سے کوئی فائدہ ہوا ہے یا کیا میں نے اس تبلیغ کا کوئی معاوضہ تم سے طلب کیا ہے؟" (۳۱)

"تم یہ کہتے ہو کہ میں شہر کے سیاسی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے ایک حجت یا نشانی (آیت) بچپن سے حاصل ہے۔ یہ ایک (غیبی) آواز ہے جو مجھے ایک خاص قدم اُٹھانے سے روک دیتی ہے اگرچہ کسی ایجابی قدم اُٹھانے کی طرف راہنمائی نہیں کرتی[۵۱]۔ یہ آواز مجھے سیاسی معاملات میں دخل دینے سے منع کرتی ہے۔ ..... اگر میں دخل دیتا اور ناانصافی اور ظلم کے خلاف آواز اُٹھاتا تو مدتوں کا میں مر چکا ہوتا۔ اس لئے اس شخص کے لئے جو انصاف اور عدل کا چلن قائم کرنا چاہتا ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ میری طرح سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہے۔" (۳۱-۳۲)

"مجھے موت سے کوئی ڈر اور خوف نہیں لیکن خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے مجھے بڑا ڈر[۵۲] ہے۔" (۳۳)

"خدا لوگوں کو خوابوں اور دیگر ذریعوں سے اپنی رضا کی اطلاع دیتا رہتا ہے۔" (۳۳)

---

۵۱ زینوفون کی رائے اس کے برعکس یہ ہے کہ یہ آواز سلبی اور ایجابی دونوں طرح کی ہدایت دیتی تھی۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق جلد ۱۱ صفحہ ۶۷۰ ب

۵۲ اسی ڈر کو قرآن نے تقویٰ کا نام دیا ہے۔

اپالوجی کے آخر میں افلاطون نے سقراط کی زبان سے موت کے بعد انسانی حالت کا ذکر چھیڑا ہے۔ سقراط کے خیال میں موت کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اچھی ہے۔ موت کے متعلق دو مختلف رائیں ہوسکتی ہیں (ا) موت ایک مسلسل اور نہ ختم ہونے والا سکون ہے جس کے بعد دوبارہ جی اُٹھنا ممکن نہیں۔ اگر یہ رائے درست ہو تو پھر موت سے بہتر سکون کہاں حاصل ہوسکتا ہے۔ (ب) اگر موت کے بعد ایک اور زندگی ہے جیسا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور جس کو سقراط اپنی ذاتی رائے کے طور پر پیش کرتا ہے[۵۱] تو ایک نیک آدمی کے لئے اس زندگی میں داخل ہونے اور قدیم زمانے کی عظیم الشان ہستیوں کی صحبت کی خوش نصیبی حاصل کرنے سے بہتر اور کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ ان ہر دو حالتوں میں سقراط کے نزدیک موت اچھائی اور بہتری ہی کا راستہ ہے۔

لیکن ایک دوسری کتاب "فیڈو" میں سقراط نہ صرف روح کی ازلیت و ابدیت کی حمایت میں مختلف دلائل پیش کرتا ہے بلکہ جنت و دوزخ کا ایک ظاہری نقشہ بھی کھینچتا ہے جہاں نیک اور بد اشخاص کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق سلوک ہوگا۔ سقراط کو اس کا دعوٰے نہیں کہ جو تفصیلی بیان اس نے جنت و جہنم کا دیا ہے وہ لفظاً لفظاً درست ہے لیکن اس بات پر اس کو پورا یقین ہے کہ سزا اور جزا ضرور ہوگی۔ موت انسانی زندگی کا انجام نہیں اور نہ بُرے لوگوں کی برائیاں مرنے کے بعد ختم ہوجائیں گی۔[۵۲] اس لئے ہر انسان کے لئے یہ سوال بہت اہم ہوجاتا ہے کہ وہ کس طرح کی زندگی بسر کرے۔ تمام مذاہب میں خدا، حیات بعد الموت اور روح کی بقا کے مسائل کو اخلاقی اور مذہبی زندگی کی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے اور یہی تینوں مسائل سقراط کے ہاں موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر ہی تمام اخلاقی مسائل کی تعمیر کی گئی ہے۔ اور آخرت کا جو نقشہ سقراط نے پیش کیا ہے اس کے متعلق خود جویٹ کا خیال یہ ہے کہ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس نے زرتشت کے تصوّرات و عقاید کا چربہ اُتارا ہے۔ جہاں کہیں سزا اور جزا کے تصوّر ملتے ہیں ان کا بیان آرفیسی عقاید سے اتنا مشابہ ہے کہ چھپا نہیں رہ سکتا۔[۵۳]

---

۵۱ دیکھئے ٹیلر کی کتاب سقراط صفحہ ۱۲۰

۵۲ فیڈو ۱۰۷

۵۳ افلاطون کی کتاب فیڈو پر جویٹ کی تمہید صفحات ۱۲۸-۱۰۹، ۱۷۲-۱۷۳